# مولوی نذیر احمد دہلوی۔ احوال و آثار اور ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

ڈاکٹر ریحانہ کوثر
Dr. Rehana Kousar

Abstract:
Deputy Nazir Ahmad Dehlavi is one of those prose writers who received great fame in their time. Much research has been done on his life and achievements. One of the researchers on his work is Dr. Iftikhar Ahmad Siddiqui. This article proves that he is the first and till last only critic who has coverred all the aspects of Nazir Ahmad's intellectual journey, and has attempted to understand his work in the right sense and prespective.

پی ایچ۔ڈی کی ڈگری کے حصول کے لیے لکھا جانے والا یہ مقالہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں تکمیل پذیر ہوا۔ اور نومبر ۱۹۷۱ء میں مجلس ترقیِ ادب لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اس مقالے کو آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے تین ابواب نذیر احمد کے ذہنی پس منظر، سوانح اور سیرت کے متعلق ہیں۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے بقول:

''کسی شاعر یا ادیب کے ذہنی اِرتقاء کا مطالعہ نہ صرف اس کی تخلیقات کی صحیح قدر شناسی میں مدد دیتا بلکہ اس کے نتیجے میں ادبی تاریخ وتنقید کے بعض گوشے بھی روشن ہو جاتے ہیں۔''(۱)

چنانچہ ذہنی اِرتقاء کے مطالعے کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اپنے مقالے کے پہلے تین ابواب پر خصوصی توجہ دی ہے اور اس سلسلے میں نذیر احمد کے سوانح کے سلسلے کی اوّلین کتاب ''حیات النذیر'' پر دوسروں کی طرح آنکھیں بند کر کے اعتماد نہیں کیا، بلکہ اس کے مندرجات کو تحقیق وتنقید کی نظر سے جانچ پرکھ کر رد یا قبول کیا ہے۔ یوں تو صدیقی صاحب کا پورا مقالہ ہی تحقیق وتنقید کی اعلیٰ روایات کا حامل ہے لیکن چونکہ اس کے پہلے تین ابواب گویا بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے انھوں نے اپنے مقالے کی بنیاد کی مضبوطی پر خصوصی توجہ دی ہے۔

حیات النذیر کی نظر فریب ضخامت اور جامعیت نے لوگوں کو ہمیشہ دھوکے میں رکھا اور اسے ایک مستند ماخذ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ صدیقی صاحب کے زیرِ نظر مقالے کی اشاعت کے

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

بعد بھی نذیر احمد پر لکھنے والوں نے ''حیات النذیر'' پر تکیہ کیے رکھا اور اس مقالے کو دیکھنے یا پڑھنے کی زحمت گوارہ نہیں کی جس میں اس کتاب کی حقیقی قدر و قیمت بڑی تفصیل کے ساتھ واضح کر دی گئی ہے۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ہی نذیر احمد کے وہ پہلے اور اب تک آخری نقاد ہیں جنھوں نے نذیر احمد کی تخلیقات کو صحیح معنوں اور صحیح تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

نذیر احمد پر اگرچہ پی ایچ۔ڈی اور ایم فل کی سطح کے کئی کام ہوئے ہیں لیکن نذیر احمد کی تخلیقات کے تحقیقی مطالعات میں سے اگر کسی ''مطالعے'' کو صحیح معنوں میں تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کہا جا سکتا ہے تو وہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کا ''مطالعہ'' ہے۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے اپنے مقالے کے پہلے باب میں حیات النذیر اور دیگر سوانحی ماخذ کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا ہے اس باب کو انھوں نے نو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں انھوں نے سوانح نگاری کے فن اور ایک اچھی سوانح نگاری کی خصوصیات (کچھ مغربی مصنّفین کے حوالے سے) بیان کرنے کے بعد نذیر احمد کی سوانح کے اوّلین ماخذ ''حیات النذیر'' کے جائزے کا آغاز کیا ہے۔ اس جائزے سے پہلے انھوں نے حیات النذیر کی روایتی شہرت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں مصنف ''حیات النذیر'' کی فرمائش پر لکھی جانے والی تقریظوں میں جو ''حیات النذیر'' کی تعریف و توصیف کی گئی ہے اس کی حیثیت واضح کی ہے اور ''حیات النذیر'' کی ترتیب و تنظیم کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ ''حیات النذیر'' کے مصنف نے محض ضخامت بڑھانے کے لیے نذیر احمد کی تصنیفات سے لمبے لمبے اقتباسات دیے ہیں۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ مصنف ''حیات النذیر'' نے کتاب کی ترتیب و تالیف میں بے حد سہل انگاری سے کام لیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''مصنف حیات النذیر کی سہل انگاری سے کتاب کا سوانحی پہلو اس حد تک ناقص رہ گیا ہے کہ اس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے اس کمی پر تعجب ہوتا ہے۔''(۲)

صدیقی صاحب نے زیرِ نظر باب میں ثابت کیا ہے کہ ''حیات النذیر'' کے مصنف نے اپنی تصنیف کا آغاز کرنے سے بہت پہلے (کم از کم ۱۸۹۸ء سے) مواد فراہم کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس زمانے میں نذیر احمد کے بجنوری عزیزوں میں سے ان کی والدہ، ان کے بڑے بھائی اور دہلی میں نذیر احمد کے کئی پرانے ساتھی اور ہم جماعت خصوصاً شمس العلماء منشی ذکاء اللہ، جن سے نذیر احمد کے تعلقات زمانۂ طالبِ علمی سے لے کر آخر تک نہایت گہرے رہے، موجود تھے۔ لیکن مصنف حیات النذیر نے ان بزرگوں سے رجوع نہیں کیا۔ ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ نذیر احمد کے سلسلۂ حیات کی وہ کڑیاں جو حیات النذیر میں غائب ہیں، غائب رہ جاتیں۔

صدیقی صاحب کے نزدیک حیات النذیر کا سوانحی حصہ بہت ناقص، سطحی اور سرسری ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس، طبیہ کالج اور انجمن حیات اسلام کے جلسوں میں نذیر احمد کی شرکت کا ذِکر سرسری ہے۔ علی گڑھ تحریک سے نذیر احمد کے تعلق اور اس سلسلے میں ان کی خدمات، سرسیّد، مولانا حالی اور محسن الملک جیسے بزرگوں سے نذیر احمد کے تعلقات کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا۔ زیرِ نظر باب میں صدیقی صاحب نے ''حیات النذیر'' کو متعدد اعتبارات سے ایک نا قابلِ اعتبار اور غیر مستند تصنیف قرار دیا ہے۔ نذیر احمد اپنے حالاتِ زندگی متعدد موقعوں پر بڑھا چڑھا کر بیان کرتے تھے۔ اس سلسلے میں صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے دہلی کالج میں داخل ہونے کی رُوداد، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی آپ بیتی، اِبتدائی ملازمت میں انگریزی سیکھنے کا واقعہ، اپنی پہلی تصنیف مراۃ العروس کے چھپنے اور یکایک ادبی شہرت حاصل کرنے نیز اس قسم کے دیگر واقعات کو بڑے ڈرامائی انداز میں بیان کیا ہے۔ گویا یہ سب واقعات ناگہانی حادثوں کی صورت میں پیش آتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے نفسیاتی محرکات بھی کارفرما تھے۔ لیکن مصنف حیات النذیر نہ تو ان محرکات پر نظر ڈالتا ہے اور نہ مبالغے کی تہوں کو کھولتا ہے۔ بلکہ ہر روایت کو بے چوں و چراں قبول کرتا ہے۔''(۳)

صدیقی صاحب نے حیات النذیر کی بے سروپا حکایت طرازی اور تضاد بیانیوں کو عمدگی سے نمایاں کیا ہے۔ نذیر احمد کی شادی کے قصے کے سلسلے میں مصنف حیات النذیر نے اور ان کے علاوہ دوسرے لکھنے والوں نے جو من گھڑت تفصیلات دی ہیں ان کی نشاندہی بھی کی ہے اور اس سلسلے میں درست حقائق کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی اس تحقیق میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں یہاں ہمیں نذیر احمد کے سوانح کے سلسلے میں متعدد نئی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں وہیں کئی افسانہ طرازیوں کی حقیقت کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان میں سے کچھ نئی باتیں نذیر احمد کے دہلی کالج میں داخلے کے سلسلے میں ہیں، کچھ اس سلسلے میں کہ نذیر احمد ہمیشہ کلاس میں اوّل آیا کرتے تھے اور کچھ باتیں نذیر احمد کی شادی کے سلسلے میں ہیں۔ مثلاً نذیر احمد کی شادی کے سلسلے میں جو اُلٹی سیدھی لیکن دلچسپ باتیں کہی گئی ہیں ان کی چھان پھٹک کرنے کے بعد صدیقی صاحب نے جو حقائق پیش کیے ہیں وہ یہ واضح کرتے ہیں کہ دہلی میں نذیر احمد کی شادی محبت کی شادی (Love Marriage) تھی اور اس شادی کے لیے انھوں نے اپنے خاندان کی روایت کو توڑنے اور والدہ کی ناراضی مول لینے کی بھی ہمت کی۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے مصنف حیات النذیر کی خامیوں کی ہی نشاندہی نہیں بلکہ زیرِ بحث میں جہاں کہیں انھیں کوئی خوبی کی بات نظر آئی ہے انھوں نے اس کی بھی تحسین کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

> ''ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بعض معاملات میں مثلاً نذیر احمد کے خلاف بخل کے الزام کی تردید اور اُمہات الامہ پر ہنگامہ تکفیر کے بارے میں فاضل مصنف نے ممکن حد تک جائز حد

تک وکالت کا حق ادا کیا ہے۔''(۴)

صفحہ ۱۸ سے ۲۳ تک حیات النذیر کی نذیر احمد کے سوانح کے سلسلے کی سنین کی غلطیاں نیز جہاں سنین کا دینا ضروری تھا وہاں مصنف حیات النذیر کی خاموشی، نیز مصنف حیات النذیر نے نذیر احمد کے حالاتِ زندگی کے سلسلے کے نہ صرف یہ کہ ضروری سنین نہیں دیے بلکہ جو سنین دیے ہیں، وہ غلط ہیں اور کئی جگہ سنین کی یہ غلطیاں مصنف کی لاعلمی اور تساہل کی وجہ سے نہیں ہوئیں بلکہ مصنف نے جان بوجھ کر غلط سن دیے ہیں۔ زیرِ نظر باب کے آخری حصے میں صدیقی صاحب نے فرحت اللہ بیگ کی سوانحی تحریر ''نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی'' کے مندرجات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ جائزے کا آغاز وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں:

''یہ عجیب اِتفاق ہے کہ جس شخص کی سوانح عمری ہمارے سوانحی ادب کا بدترین نمونہ ہے اسی کا (سوانحی) خاکہ (نذیر احمد کی کہانی۔۔۔) اُردو میں مرقع نگاری کا بہترین شاہکار ہے۔''(۵)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مرزا فرحت اللہ بیگ کی خوش مذاقی اور ذہانت کے تو قائل ہیں اور اس کی تعریف بھی کرتے ہیں لیکن سوانحی نقطہ نظر سے اس تحریر میں جو نقائص ہیں وہ بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہے۔ اس سوانحی خاکہ میں جو غلط بیانات ہیں، ناموں اور واقعات کی جو غلطیاں ہیں صدیقی صاحب نے ان کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر صدیقی کے نزدیک ''نذیر احمد کی کہانی۔۔۔'' کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ:

''تحقیق کی ان خامیوں کے علاوہ مرزا صاحب کی شوخیٔ تحریر نے بھی اس خاکے کو سوانحی صداقت وثقافت کے مرتبے سے گرا دیا ہے۔۔۔ چٹ پٹے پن کی خاطر مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے اُستاد کی ہر روایت کو جرح وتعدیل کے بغیر قبول کر لیا ہے۔۔۔ فرحت میں غپ اُڑانے کا شوق خاندانی تھا اور بچپن سے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اُستاد کی رنگین بیانی اور شاگرد کی حاشیہ آرائی، دونوں نے مِل کر اس خاکے میں مئے دو آتشہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔''(۶)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، نذیر احمد کے فن پر لکھنے والے پہلے مقالہ نگار ہیں جنھوں نے نذیر احمد کے ذہنی سفر کی رُوداد پوری جزئیات کے ساتھ اور بڑی محنت سے مرتب کی ہے۔ انھوں نے بہت باریک بینی کے ساتھ نذیر احمد کے تصوّرات اور نظریات کو، جیسا کہ وہ تھے پیش کیا ہے۔ نذیر احمد کے ذہنی ارتقاء کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے انھوں نے ماٰخذ تک رسائی حاصل کی ہے جو ان سے پہلے لکھنے والوں کی نگاہ سے پوشیدہ تھے۔ نذیر احمد کے سلسلے کی تحقیق وتنقید کے راستے پر انھوں نے قدم بہ قدم (Step by Step) بہت احتیاط کے ساتھ سفر کا آغاز کیا ہے اور اپنی منزل تک بہت ہوش مندی کے ساتھ پہنچے ہیں۔ نذیر احمد کے خاندانی حالات کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے سلسلے میں انھوں نے دوسروں کی

طرح آنکھیں بند کر کے ''حیات النذیر'' کے بیانات کو ہی کافی نہیں سمجھ لیا بلکہ اس سلسلے میں ایسی تحقیق اور تجسس کا مظاہرہ کیا ہے کہ نذیر احمد کا خاندانی پس منظر پوری طرح روشن ہو کر سامنے آ جاتا ہے۔

صدیقی صاحب کے مقالے کے دوسرے باب کا عنوان ''نذیر احمد کا ذہنی پس منظر'' ہے۔ اس باب میں صدیقی صاحب نے نذیر احمد کے خاندانی حالات کے بارے میں وضاحت کے ساتھ معلومات فراہم کی ہیں اور ''حیات النذیر'' کی غلط بیانیوں کو واضح کیا ہے۔ نذیر احمد کے والد کیسے بزرگ تھے، نذیر احمد کا بچپن کیسا گزرا، نذیر احمد کے والد نے انھیں کیسی تعلیم دی، نذیر احمد کے بچپن میں شب و روز کیسے گزرے، ان سب امور کے بارے میں اگر ہمیں کچھ ٹھوس معلومات ملتی ہیں تو وہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ہی کے مقالے سے ملتی ہیں۔ صدیقی صاحب نے اپنے مقالے کے دوسرے باب کے دوسرے حصہ میں نذیر احمد کی تعلیم و تربیت کے دوسرے مرحلے کی تفصیلات دی ہیں اور بتایا ہے کہ نذیر احمد کی عمر ۹ سال تھی جب نذیر احمد کے والد نے انھیں مولوی نصر اللہ خاں خورجوی کے سپرد کیا۔ مولوی نصر اللہ خورجوی کون تھے؟ ان کے تعلیم دینے کا انداز کیسا تھا؟ کتنے عرصے تک نذیر احمد نے نصر اللہ خورجوی صاحب سے تعلیم حاصل کی اور یہ کہ نذیر احمد پر نصر اللہ خورجوی صاحب کی تعلیم اور ان کی شخصیت کے کیسے اثرات پڑے۔ ان سب امور کے بارے میں صدیقی صاحب نے جامع معلومات فراہم کی ہیں۔

نذیر احمد کے اوّلین سوانحی ماخذ ''حیات النذیر'' میں نذیر احمد کی تشکیک و تذبذب کے اس دور کا کوئی ذِکر نہیں ملتا۔ صدیقی صاحب نے بھی ''حیات النذیر'' کے حوالے سے نقل کیا ہے لیکن حیات النذیر کو حرفِ آخر سمجھتے ہوئے نہیں بلکہ اصل حقائق کو منظرِ عام پر لانے کے لیے اس پر یوں بحث کی ہے:

> ''ماسٹر رام چندر مشہور ریاضی دان ہمارے مولانا کے اُستاد نے اسلام کی تردید میں ایک کتاب انگریزی میں لکھی تھی۔ مولانا سے اس کے ایک باب کا ترجمہ کرایا۔ اس ترجمے کو کہیں مولوی عبدالقادر مرحوم نے دیکھ پایا تو فتویٰ لیے پھرے کہ اس کا نکاح رہا یا گیا۔''(۷)

حیات النذیر کا مندرجہ بالا اقتباس دینے کے بعد صدیقی صاحب اس پر اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

> ''مصنف حیات النذیر کو یاد نہ رہا کہ نذیر احمد جو اِس زمانے میں انگریزی سے مطلق نابلد تھے اپنے اُستاد کی انگریزی کتاب کا ترجمہ کیسے کر سکتے تھے۔ اگر بالفرض ترجمہ کیا بھی تو محض اس خطا پر مولوی عبدالقادر جیسا عالم اپنے داماد کے خلاف فتوے لیتا پھرے، یہ اور بھی مضحکہ خیز بات ہے۔''(۸)

اور صدیقی صاحب نے چھان پھٹک کی عمدہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے اصل حقائق کو نکھار کر بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں انھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ دہلی شہر کے بارے میں، اس کی تہذیب و تمدن، اس کے سلیقہ و نفاست اور یہاں کی علمی و ادبی

فضا کا نقشہ بہت خوبصورتی کے ساتھ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ بسلسلۂ تعلیم دہلی میں نذیر احمد کا بارہ سال کا قیام ان کی زندگی کا اہم ترین دور ہے۔

ڈاکٹر افتخار احمد کے زیرِ نظر مقالے کے تیسرے باب کا عنوان ہے ''سوانح و سیرت'' یہ باب بھی خاصا طویل ہے۔ یہ صفحہ ۶۷ سے صفحہ ۱۵۳ تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس کا یہ پھیلاؤ ہر اعتبار سے معقول، فطری اور ضروری ہے۔ نذیر احمد کی مفصل سوانح عمری لکھنا چونکہ مقالہ نگار کا موضوع نہیں تھا، لہٰذا انھوں نے اپنے موضوع کی حدود کا خیال رکھتے ہوئے غیر مصدقہ اور غیر ضروری تفصیلات سے صرفِ نظر کیا ہے اور نذیر احمد کی تصانیف ہی سے ان کے حالاتِ زندگی اخذ کرنے کی کوشش کی ہے تاہم مقالہ نگار نے دیگر ماخذ سے بھی معلومات حاصل کی ہیں لیکن اس باب میں انھوں نے صرف ایسی معلومات پیش کی ہیں جو نذیر احمد کی سیرت اور شخصیت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

صدیقی صاحب نے نذیر احمد پر اس اِلزام کو بھی مسترد کیا ہے کہ نذیر احمد کی بود و باش قلندرانہ تھی اور ان کے سادہ طرزِ زندگی کی وجہ سے ان کو کنجوس مشہور کیا گیا۔ ڈاکٹر افتخار صدیقی نے نذیر احمد پر اس الزام کا بہت عمدہ تجزیہ کیا ہے اور ان کے حالاتِ زندگی سے متعدد مثالیں دے کر ثابت کیا ہے کہ وہ ہرگز بخیل نہ تھے۔

چوتھے باب میں صدیقی صاحب نے سرسیّد احمد خاں اور نذیر احمد کے اجتہادی میلانات کی نشاندہی کی گئی ہے اور ان دونوں بزرگوں کے مذہبی خیالات میں اِشتراک کے پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ صدیقی صاحب کے مطابق علی گڑھ تحریک کے آغاز سے ہی قومی تعلیم کے بارے میں دو رُجحانات پیدا ہو گئے تھے۔ سرسیّد آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے طرز پر ایک اعلیٰ درجے کی مرکزی درسگاہ قائم کرنا چاہتے تھے لیکن سرسیّد کے اس نقطۂ نظر کے خلاف اخبارات میں تجویز پیش کی گئی کہ ایک مرکزی مثالی اِدارہ قائم کرنے کی بجائے مختلف مقامات پر اسلامیہ سکول کھولے جائیں تو وہ قوم کے حق میں زیادہ مفید ہوں گے۔ سرسیّد نے اس تجویز کے خلاف تہذیب الاخلاق میں مضامین بھی لکھے لیکن اس کے باوجود مختلف شہروں میں مسلمانوں کی تعلیم کے لیے انجمنیں قائم ہوئیں اور ان انجمنوں کے زیرِ انتظام سکول کھولے گئے۔ ایسی انجمنوں میں سے ایک لاہور کی انجمن حمایتِ اسلام تھی۔ نذیر احمد نے اس انجمن کے لیے بہت خدمات انجام دیں۔ زیرِ نظر باب کے اس حصہ میں علی گڑھ کالج، اسلامیہ کالج جیسے اِداروں کے لیے نذیر احمد کی خدمات پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

زیرِ نظر مقالے کے پانچویں باب میں صدیقی صاحب نے نذیر احمد کے تراجم، درسی و اخلاقی کتب، مکتوبات، خطبات اور قومی نظموں کا جائزہ لیا ہے۔ نذیر احمد کے تراجم میں ''انکم ٹیکس ایکٹ''، ''مجموعہ قوانین تعزیرات ہند''، ''اصلاح ترجمہ ضابطہ فوجداری'' اور ''قانونِ شہادت'' شامل ہیں، پر بحث کی ہے اور ''مجموعہ قوانین تعزیراتِ ہند'' کی خصوصی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ''مجموعہ قوانین تعزیراتِ

ہند'' میں اصطلاحات کے عمدہ ترجمہ کی خوبی کو صدیقی صاحب نے یوں سراہا ہے:

''انھوں نے آج سے سو برس پہلے عدالتی اور قانونی زبان کا ایک ایسا معیار قائم کر دیا جس کی پیروی۔۔۔آج بھی سندِ فضیلت ہے۔تعزیرات کی اِصطلاحوں کا اب تک رائج رہنا۔۔۔ ایک ادبی اور لسانی معجزہ ہے۔''(۹)

''مصائب غدر'' کو صدیقی صاحب نے جدید نثری اِرتقاء کی گمشدہ کڑی قرار دیا ہے۔ ''مصائبِ غدر'' ولیم ایڈورڈ رس کی ایامِ غدر کی آپ بیتی تھی جو اس نے روزنامچہ کی صورت میں لکھی تھی۔ بابو شیو پرشاد کے کہنے پر نذیر احمد نے اس کا اُردو ترجمہ کیا لیکن بعد میں نذیر احمد کو یہ احساس ہوا کہ اس میں ہندوؤں کے مفادات پوشیدہ ہیں۔اس وجہ سے نذیر احمد اس تصنیف کو منظرِ عام پر لانے سے گریزاں تھے۔نذیر احمد کی اس تصنیف کا مصنف ''حیات النذیر'' نے ذِکر نہیں کیا۔صدیقی صاحب کے نزدیک نذیر احمد کے تراجم میں سب سے اہم ترجمہ ''سماوات'' ہے۔اس ترجمہ کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے اُنیسویں صدی میں جدید سائنسی علوم کے تراجم کے سلسلے میں بہت عمدہ اور تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں اور ''سماوات'' سے ان تراجم کا تقابل کرنے کے بعد نذیر احمد کی برتری ثابت کی ہے۔

''درسیات و اخلاقیات'' کے زیرِ عنوان صدیقی صاحب نے نذیر احمد کی اِبتدائی تین تصانیف ''منتخب الحکایات''، ''چند پند سودمند'' اور مراۃ العروس پر گفتگو کی ہے۔''حیات النذیر'' میں ''مراۃ العروس'' کو نذیر احمد کی پہلی تصنیف قرار دینے، مسٹر کیمپسن کے اتفاقاً بشیر الدین احمد سے ملنے، مراۃ العروس منگوا کر پڑھنے اور اس کتاب کو انعام کی مستحق قرار دینے، ان سب باتوں کو صدیقی صاحب نے من گھڑت قصہ قرار دیا ہے اور ''چند پند سودمند'' اور ''منتخب الحکایات'' کو نذیر احمد کی اوّلین تصانیف قرار دیا ہے کیونکہ یہ دونوں تصانیف موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے کمتر درجے کی ہیں۔اپنی اس بات کے ثبوت میں صدیقی صاحب نے ایک حوالہ دہلی کالج میگزین میں عبدالرحمن کے شائع ہونے والے مضمون سے جب کہ دوسرا حوالہ مولوی رحیم بخش کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے ''چند پند سودمند'' کے ایڈیشن کے دیباچہ سے دیا ہے۔

''منتخب الحکایات'' کا مقامِ تصنیف ''ضلع جالون'' قرار دیا گیا ہے۔صدیقی صاحب کی تحقیق کے مطابق سرکاری گزیٹر میں ''جالون'' میں نذیر احمد کا تبادلہ ۱۸۶۲ء کے لگ بھگ اور ''گورکھپور'' میں ۱۸۶۷ء کے اواخر میں ہوا تھا۔ ۱۸۶۶ء میں نذیر احمد نے ''مراۃ العروس'' کا اِبتدائی حصہ لکھا تھا، لہٰذا انھوں نے اِبتدائی تصانیف کی خانگی حیثیت کا ذکر کر کے اپنی فکر اور ذہنی اپج کو عصری تحریکات سے آزاد اور بے تعلق ظاہر کیا ہے اور اِنعامی اعلان پر زمانی تقدم دِکھائی ہے۔صدیقی صاحب نے نذیر احمد کے گورکھپور کے ذِکر سے احتراز کی اہم وجہ بتائی ہے کہ:

''گورکھپور کے ذِکر سے ان کے احتراز و انقباض کا سبب یہ ہے کہ وہاں ان کے ایک بزرگ

معاصر لیکن گمنام و گوشہ نشین مصنف، مولوی وزیر علی نے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی کی اِصلاح اور خواتین کی اخلاقی و دِینی تربیت کے لیے مرآۃ النساء کے نام سے واقعات قصوں کا ایک مجموعہ ۶۴۔ ۱۸۶۳ء میں مرتب کیا تھا۔۔۔گورکھپور میں طویل قیام کے دوران میں نذیر احمد، مولوی وزیر علی اور ان کی اس تصنیف سے متعارف و مستفید ہوئے۔۔۔واقعیت کی طرف نذیر احمد کا یہ میلان بھی غالباً مرآۃ النساء کے مصنف کا فیضان ہے۔''(۱۰)

اسی باب میں صدیقی صاحب نے نذیر احمد کی تصنیف ''مایغنیک فی الصرف'' کے سنِ تصنیف اور سنِ طباعت کے حوالے سے مصنف ''حیات النذیر'' سے اختلاف کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ نذیر احمد نے یہ کتاب ۱۸۶۰ء میں لکھنا شروع کی اور ۱۸۷۱ء میں مکمل ہونے پر خود انعام کے لالچ میں محکمہ تعلیم میں پیش کی تھی۔

فاضل محقق نے نذیر احمد کے رسائل ''نصاب خسرو''، ''صرف صغیر'' اور رسم الخط پر بھی مختصراً بحث کی ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے ''متفرقات'' کے زیرِ عنوان نذیر احمد کی مکتوب نگاری، خطابت اور شاعری کا جائزہ لیا ہے اور نذیر احمد کی تحریروں سے مثالیں دے کر زبان وفن کے اعتبار سے عمدہ تجزیہ کیا ہے۔ زیرِنظر مقالے کا اگلا حصہ نذیر احمد کی مذہبی تصانیف کے جائزے کے لیے وقف ہے۔ نذیر احمد کے ''ترجمۃ القرآن'' کو تراجم کے سلسلے سے علیحدہ کر کے مذہبی تصانیف میں سب سے پہلے جگہ دی ہے کیونکہ یہ ترجمہ توضیحی اضافوں، تفسیری حاشیوں اور دیگر خصوصیات کی بنا پر مستقل تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ''ترجمۃ القرآن'' نذیر احمد کی بیشتر مذہبی تصانیف کی بنیاد اور اس سلسلے کا نقطۂ آغاز ہے۔ فاضل محقق کے خیال میں مترجم کے لیے پہلی شرط زبان دانی، دوسری شرط عملی تجربہ اور فنی مہارت جب کہ تیسری شرط تفاسیر و احادیث پر گہری نظر ہے۔ نذیر احمد میں یہ خوبیاں موجود تھیں ماسوا علومِ دینیہ میں دسترس۔ لہٰذا اپنی اس کوتاہی کے لیے انھوں نے جید عالموں سے مدد لی۔ صدیقی صاحب نے ان حضرات کی غلط فہمی بھی دور کی ہے جو نذیر احمد کے مبالغہ آمیز بیانات کی وجہ سے یہ سمجھ بیٹھے کہ ''ترجمۃ القرآن'' کے مترجم حافظ محمد صاحب ہیں۔

''الحقوق والفرائض'' اور ''اُمہات الامہ'' پر تبصرہ حسبِ معمول صدیقی صاحب کی محققانہ کاوش کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ''اُمہات الامہ'' کی تصنیف کے محرک، مذکورہ تصنیف کا نذیر احمد کا اپنے نام کی بجائے پریس منیجر رحیم بخش کے نام سے شائع کرانے، اس تصنیف میں نذیر احمد کی کوتاہیوں اور اُمہات الامہ کی تمام جلدیں جلا دینے کے حوالے سے بشیر الدین احمد اور شاہد احمد دہلوی کے بیانات اور ان بیانات کی تردید، ان سب پہلوؤں پر بہت عمدہ تبصرہ کیا ہے۔ ''اُمہات الامہ'' پر اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

''بہر حال ''اُمہات الامہ'' کو یہ امتیاز ضرور حاصل ہے کہ یہ اُردو کی سب سے زیادہ ہنگامہ

آفرین کتاب اور اپنے عہد کی سب سے زیادہ ناکام و مردود تصنیف ہے۔"(۱۱)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے نذیر احمد کی "مطالب القرآن" کو ان کی پنجاہ سالہ زندگی کی آخری یادگار قرار دیا ہے۔ مصنف حیات النذیر نے اس تصنیف کا کہیں ذِکر نہیں کیا جب کہ صدیقی صاحب نے مذکورہ تصنیف کے طبع اوّل کے سرورق کی عبارت سے نتیجہ اخذ کیا ہے، کہ نذیر احمد نے اس کا پہلا حصہ اپنی زندگی میں ہی ۱۹۱۰ء۔۱۹۰۹ء کے درمیان چھپوا ڈالا تھا۔ صدیقی صاحب کے مطابق اس کتاب کا منصوبہ نذیر احمد کے ذہن میں "ترجمۃ القرآن" کے وقت سے تھا، جس طرح مضامین قرآن کی فہرست چھ حصوں پر مشتمل تھی بالکل اسی طرز پر وہ "مطالب القرآن" کو بھی مکمل کرنا چاہتے تھے:

"اُمہات الامۃ" کے ہنگاموں کے بعد نذیر احمد کچھ ایسے دِلبرداشتہ ہوئے کہ مطالب قرآن کا پہلا حصہ بھی ادھورا چھوڑ دیا، اگر یہ سلسلہ مکمل ہوجاتا تو مطالب قرآن اُردو میں بالکل نئی شان کی تفسیر ہوتی۔"(۱۲)

"نذیر احمد کی ناول نگاری (پہلا دور)" زیرِنظر مقالے کا ساتواں باب ہے۔ اس باب کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس باب کے پہلے حصہ میں "اُردو میں ناول کا تہذیبی پس منظر" میں صدیقی صاحب نے اُردو میں قدیم داستانوں کے پُراسرار طلسماتی، سامراجی ماحول سے جدید ناول کی واقعاتی اور عوامی فضا تک اِرتقائی سلسلہ کی بحث کی ہے۔ اس فضا کی تخلیق میں اُردو صحافت نے اہم کردار ادا کیا۔ علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ صحافت کا شاہکار تھا۔ شمالی ہند میں عام خیالات کی تبدیلی اور معلومات کی ترقی اسی پرچے کے اِجراء سے ہوئی۔

انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ثقافتی اور علمی انجمنوں کے قیام پر فاضل محقق نے اِختصار لیکن جامعیت کے ساتھ معلومات فراہم کی ہیں۔ اس وقت صوبہ شمال مغربی کے گورنر سر ولیم میور، اُردو زبان کے حامی و سرپرست تھے۔ اس دور میں لڑکیوں کے مدارس بھی قائم ہو چکے تھے اور حکومت کی طرف سے محکمہ تعلیم کے زیرِ اہتمام نئی کتابیں لکھوائی جارہی تھیں۔ خواتین کے لیے خصوصاً کتابیں لکھوائی جارہی تھیں۔

مراۃ العروس کے دیباچہ میں نذیر احمد نے ظاہر کیا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے اپنی بچیوں کی تعلیم کے لیے لکھی تھی جب کہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ "مراۃ العروس" کی تصنیف کا اصل محرک گورنمنٹ کی طرف سے ادبی انعام کا حصول تھا۔ صدیقی صاحب نے "مراۃ العروس" کے دیباچہ ہی سے اِقتباس دیا ہے، جس میں نذیر احمد کی مذکورہ بالا تصنیف کا اصل محرک واضح کیا ہے:

"جب میں نے دیکھ لیا کہ یہ کتاب عورتوں کے لیے نہایت مفید ہے۔۔۔ اس کو جناب ڈائریکٹر بہادر مدارس ممالک شمال مغربی کے ذریعے سے سرکار میں پیش کیا۔۔۔"(۱۳)

صدیقی صاحب کے مطابق ''مراۃ العروس'' کا دیباچہ اس وقت لکھا گیا، جب ایم کیمپسن اپنی جگہ موجود تھے، لہٰذا نذیر احمد کے لیے اس حقیقت کے اعتراف کے سوا چارہ نہ تھا کہ کتاب انھوں نے خود اِنعام کے لیے پیش کی تھی لیکن برسوں بعد جب کوئی تصدیق کرنے والا نہ رہا تو نذیر احمد کو لیکچرز میں داستان طرازی کا موقع مِل گیا۔ صدیقی صاحب کے مطابق اس لیے سر ولیم میور اور مسٹر ایم کیمپسن نے اس کتاب پر حوصلہ افزا تقریظیں لکھیں اور نذیر احمد کی حقیقت نگاری کی تعریف کی۔ ''مراۃ العروس'' کی ادبی فنی حیثیت متعین کرنے کے لیے اُردو قصوں کے تخلیئیت سے واقعیت کی طرف میلان کا جائزہ صدیقی صاحب کو گھر سے ہی ''مرآۃ النساء'' کا نسخہ ملا۔ یہ نسخہ ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا۔ اُردو ادب میں واقعاتی اور اِصلاحی کہانیوں کا پہلا مجموعہ صدیقی صاحب مولوی وزیر علی کی ''مرآۃ النساء'' کو قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے ''مرآۃ النساء'' کے سنہ تصنیف کے حوالے سے مرآۃ النساء کو ''مراۃ العروس'' پر اوّلیت دی ہے۔ مؤلف حیات النذیر نے ''مرآۃ النساء'' کو ان کتابوں میں شمار کیا ہے جو ''مراۃ العروس'' کے اِتباع میں لکھی گئیں۔ صدیقی صاحب نے اس کی تردید کی ہے اور بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ ''مراۃ العروس''، ''مرآۃ النساء'' کے اِتباع میں لکھی گئی۔ زیرِ نظر تحقیقی مقالے کے ساتویں باب کا تیسرا حصہ صدیقی صاحب نے نذیر احمد کی قصہ گوئی کے محرکات کے لیے وقف کیا ہے ان کے مطابق نذیر احمد کی قصہ گوئی کا بنیادی محرک قومی اِصلاح کا جذبہ تھا۔ نذیر احمد یہ بات بھی بخوبی جانتے تھے کہ جب تک اِسلام کی بنیادی اقدار کو نہ اپنایا جائے گا، قوم ترقی کی شاہراہ پر قدم نہیں رکھ سکتی۔ اس لیے نذیر احمد نے اپنی اِصلاح کہانیوں کی بنیاد انھی اقدار پر رکھی۔

صدیقی صاحب نے نذیر احمد کے قصوں کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اچھی تنقید کا منصب یہی ہے کہ وہ پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر غیر جانبداری کا پرچم سربلند رکھے۔ اس ضمن میں مثال ملاحظہ کیجیے:

> ''قصے (مراۃ العروس) کی ہیئت و تشکیل میں سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ مقصدیت کی زد میں آ کر قصے کا پلاٹ دولخت ہو گیا۔۔۔ قصہ پن اور قصے کی جاذبیت اور دِلکشی کم ہے۔ نذیر احمد نے قصے کو سبق آموز بنانے کی کوشش میں ہیئت کی فنی تشکیل کا خیال نہیں رکھا۔''(۱۴)

صدیقی صاحب نے نذیر احمد کے تعلیمی و اِصلاحی سلسلے کا تیسرا ناول ''توبۃ النصوح'' قرار دیا ہے۔ اس کی دلیل کے طور پر سن تصنیف کے حوالے سے مختلف اشاعتوں کا ذِکر کرتے ہوئے صدیقی صاحب کا مؤقف ہے کہ:

> ''اس کے آخر میں تاریخ تحریر ۱۱ ستمبر ۱۸۷۳ء درج ہے۔''(۱۵)

اس سلسلے میں ایک اور دلیل صدیقی صاحب نے ''بنات النعش'' کے دیباچہ سے بھی پیش کی

ہے جس میں نذیر احمد نے اگلے سال تک نئی کتاب پیش کش ناظرین کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ صدیقی صاحب نے ڈاکٹر محمد صادق کے مضمون ''نذیر احمد۔ایک جائزہ'' کے حوالے سے نذیر احمد کے ناول ''توبۃ النصوح'' کا ماخذ اٹھارویں صدی کے ایک انگریزی ناول نگار ڈینیئل ڈیفو (Daniel Defoe) کا مذہبی ناول دی فیملی انسٹرکٹر (The Family Instructor) قرار دیا ہے۔ صدیقی صاحب نے ان دونوں ناولوں کا فنی تجزیہ وتقابل کر کے ''توبۃ النصوح'' کا صحیح مقام متعین کیا ہے:

> ''توبۃ النصوح کا صرف بنیادی خاکہ انگریزی ناول سے ماخوذ ہے لیکن قصے کی تعمیر میں نذیر احمد نے تمام مسالہ اپنے گرد وپیش کے ماحول اور زندگی کے ذاتی تجربات اور مشاہدات سے فراہم کیا ہے۔۔۔توبۃ النصوح کا ادبی مقام بھی انگریزی ناول سے بدرجہا بلند ہے۔ اگرچہ، ڈیفو اپنے عہد کا مشہور ادیب اور ناول نگار تھا لیکن انگریزی ادب میں اس کی اس تصنیف کی کوئی حیثیت نہیں، اور توبۃ النصوح کا شمار اُردو کے چند بہترین ادبی شہ پاروں میں ہوتا ہے۔''(۱۶)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے تحقیقی مقالے کا آخری اور آٹھواں باب ''نذیر احمد کی ناول نگاری (دوسرا دور)'' ہے۔ صدیقی صاحب کے مطابق ''توبۃ النصوح'' کی اشاعت (۱۸۷۴ء) کے بعد دس سال تک نذیر احمد کی ادبی تخلیقات کا سلسلہ منقطع رہا۔ ۱۸۸۴ء میں جب وہ پنشن لے کر دہلی آئے تو ان کی ناول نگاری کا دوسرا دور شروع ہوا جو ۱۸۹۴ء تک جاری رہا۔ دوسرے دور کے ناولوں کو صدیقی صاحب نے موضوع اور فن کے لحاظ سے دو اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔معاشرتی ناول، ۲۔نظریاتی ناول۔

معاشرتی ناولوں کے زمرے میں صدیقی صاحب نے ''فسانہ مبتلا'' اور ''ایامیٰ'' کو رکھا ہے اور نظریاتی ناولوں کے زمرے میں ''ابن الوقت'' اور ''رویائے صادقہ'' کو۔ فاضل مقالہ نگار نے نذیر احمد کی اس دور کی ناول نگاری کا معاشرتی، سماجی اور دینی محرکات کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ ان کے مطابق ''فسانۂ مبتلا'' اور ''ایامیٰ'' میں چند خصوصیات مشترک ہیں۔ مثلاً دونوں ناول معاشرتی زندگی کے اہم مسائل یعنی تعدد ازدواج اور عقد بیوگان سے متعلق ہیں اور دونوں ناولوں میں ایک ہی کردار پورے ناول پر یوں چھایا ہوا ہے کہ ناول اس کردار کی سوانح عمری بن گیا ہے، دونوں ناولوں میں رومان کی ہلکی سی چاشنی اور جنسی مسائل کا ذِکر بھی ہے۔ لیکن سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان دونوں ناولوں میں نذیر احمد کی فنی چابکدستی، ان کی مقصدیت پر غالب نظر آتی ہے۔ صدیقی صاحب نے فنی حوالے سے ''فسانۂ مبتلا'' کا مقام متعین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''فسانۂ مبتلا کے پلاٹ کی تشکیل میں نذیر احمد نے بہتر سلیقہ دکھایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے توبۃ النصوح کی تصنیف کے بعد گزشتہ دس سال کا زمانہ ادبی تعطل کی بجائے

فنی اِکتسابات میں گزارا ہے۔‘‘(۱۷)

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے زیرِ نظر آٹھویں باب ہی میں نذیر احمد کے ناول ’’ایامیٰ‘‘ (۱۸۹۱ء) پر گفتگو کی ہے۔ اُن کے مطابق نذیر احمد نے ’’ایامیٰ‘‘ میں جدید تحلیلِ نفسی کے ذریعے قلب و ذہن میں احساس وفکر کے اُبھرتے اور مٹتے ہوئے نقوش کو نگاہیں جما کر دیکھنے اور دِکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے مطابق ’’ایامیٰ‘‘ کا پلاٹ واقعات کی بجائے کرداروں کے خیالات اور محسوسات کے تانے بانے سے بنا گیا ہے۔ اس ناول میں نذیر احمد کی کردار نگاری نے فنی تکمیل کی کئی منزلیں طے کیں۔

ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کے مطابق نذیر احمد کے ناول ’’رویائے صادقہ‘‘ کی تصنیف کا مقصد مذہبی معاملات میں بے جا تشدد اور مختلف فرقوں میں افراط وتفریط کے رُجحانات کی اِصلاح ہے۔

> ’’رویائے صادقہ میں بھی طنز ومزاح کے حربے بھرپور طریقے سے اِستعمال کیے گئے ہیں، یہاں بھی نئی تہذیب کے پرستاروں اور پرانی تہذیب کے علمبرداروں، کالج کے نوجوانوں، صوفیوں، مولویوں اور دِلّی کے شریف زادوں میں سے ہر طبقے کی باری باری خبر لی گئی ہے۔‘‘(۱۸)

’’رویائے صادقہ‘‘ میں نذیر احمد کی خامیوں کی نشاندہی بھی صدیقی صاحب نے کی ہے لیکن صدیقی صاحب نے نذیر احمد کے اس ناول پر اس قدر تفصیلی تبصرہ نہیں کیا، جس طرح کے باقی ناولوں پر کیا۔ آگے چل کر ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے نذیر احمد کے اسلوب پر بحث کرتے ہوئے نذیر احمد کی لفاظی، محاورہ بندی، زورِ بیان، عربی و فارسی الفاظ کے استعمال کا ہی ذِکر نہیں کیا بلکہ ان کے استعمال کرنے کا اصل محرک اور پس منظر بھی بیان کیا ہے۔ نذیر احمد کے روزمرہ ومحاورہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ’’انھیں روزمرہ اور محاورہ اور زبان و بیان کا مطلق العنان فرمانروا تسلیم کیا جاتا ہے۔‘‘(۱۹)

نذیر احمد نے مکالموں کا فطری انداز برقرار رکھنے کے لیے جو متروک الفاظ ومحاورات اِستعمال کیے، صدیقی صاحب نے ان کی بھی نشاندہی کی ہے۔ نذیر احمد کے اسلوبِ بیان کے سلسلہ میں صدیقی صاحب نے مختلف مبصرین، جن میں مولوی عبدالحق، مہدی افادی، ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر اعجاز حسین شامل ہیں کی آراء پر بحث کی ہے اور ان کی تصدیق یا تردید بہت سلیقے کے ساتھ اور سلجھے ہوئے انداز میں کی ہے۔

# حوالہ جات


۱۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی—احوال و آثار، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء، ص پیش لفظ

۲۔ ایضاً، ص ۸

۳۔ ایضاً، ص ۱۰

۴۔ ایضاً، ص ۱۵

۵۔ ایضاً، ص ۲۸

۶۔ ایضاً، ص ۲۹

۷۔ افتخار عالم مارہروی، حیات النذیر، دہلی: شمس پریس، ۱۹۱۲ء، ص ۹۷ بحوالہ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی—احوال و آثار، لاہور: مجلس ترقیٔ ادب، ۱۹۷۱ء، ص ۶۸

۸۔ افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر، مولوی نذیر احمد دہلوی—احوال و آثار، ص ۲۸

۹۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۱۰۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۱۱۔ ایضاً، ص ۳۰۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۳۱۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۱۴۔ ایضاً، ص ۳۳۷

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۴۷

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶۰

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۲۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۱۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۲۱